مولانا عتیق الرحمٰن

بھارتی سکولرزم اور مسلمان

۱۵ اگست کو ہندوستان کی آزادی کے دس سال پورے ہو گئے۔ آیئے اب ایک سرسری نظر سے جائزہ لیں کہ اس دس سال کے دورِ آزادی نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی پر کیا اثر ڈالا ہے؟ اور اس عرصہ کے جدید حالات نے کن کن اہم مسائل سے ہمیں دوچار کر دیا ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب انگریزوں نے اقتدار ہندوستانیوں کی طرف منتقل کیا تو تقسیم کے پیدا کردہ خاص حالات کی بنا پر ملک کے اس حصہ کی زمام کار جو آج ہندوستان کہلاتا ہے فی الحقیقت یہاں کے اکثریتی فرقہ کے ہاتھ میں آئی جس طرح کہ پاکستان کہلانے والے حصہ کا اقتدار وہاں کے اکثریتی فرقہ کے ہاتھ میں۔ مگر یہاں اُس وقت اختیارات پر قبضہ پانے والی جماعت چونکہ خالص اکثریتی فرقہ کی نہیں تھی بلکہ تمام فرقوں کے کچھ نہ کچھ عناصر اس میں شریک تھے اور روزِ اوّل سے وہ اپنا پلیٹ فارم مشترک بناتی رہی تھی، اس لئے قدرتی طور پر کچھ تو اس "مشترک پلیٹ فارم" کے عنوان کی لاج رکھنے کے خیال سے اور کچھ دوسری مصلحتوں کے تقاضے کی بنا پر اس برسرِ اقتدار جماعت نے یہاں کی حکومت کو اکثریتی فرقہ کی طرف منسوب کرنے کے بجائے سیکولر رکھنا پسند کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ مختلف فرقوں کے وجود کی جو بنیاد ہے یعنی مختلف مذاہب، ان میں سے کسی مذہب سے حکومت کو کوئی واسطہ نہ ہوگا، نہ کوئی مذہب حکومت میں دخیل ہوگا اور نہ حکومت کسی مذہب میں مداخلت کرے گی۔

بظاہر بڑی معقول بات تھی اور مختلف فرقوں کے دیس میں سب کو مطمئن کرنے کی واحد تجویز۔ لیکن جیسا کہ تحریکِ خلافت کے بعد بعض غیر مسلم کانگرسی لیڈروں کے ذہنی تغیر اور آزادی کے بعد قیادت اور قانون سازی کا منصب پانے والے افراد کے افکار و نظریات پر نظر رکھنے والے شروع ہی میں اس کا کچھ اندازہ رکھتے تھے، عمل کے میدان میں مرکزی اور ریاستی حکومتیں اس نقشے سے مختلف لائنوں پر چل پڑیں جو سیکولرزم کے نظریہ سے سمجھا گیا تھا۔ اور آج تک اسی راستہ پر چلی جا رہی ہیں۔

تحریکِ خلافت کے بعد اکثریتی فرقہ سے تعلق رکھنے والے بعض لیڈروں کے ذہن میں جو تبدیلی آگئی تھی اور پھر اس کے اثر سے کانگرس کے اندر ملک کے مستقبل کے بارے میں کانگرسی رہنماؤں کے سابق ذہن سے مختلف ذہن رکھنے والا ایک مؤثر طبقہ جو پیدا ہوا صرف اس کی حد تک اگر غور کیا جائے تو نظر آئے گا کہ جنگِ آزادی کے دوران ہی میں، آزادی کے بعد اپنے تہذیبی غلبہ کا منصوبہ اس کے پیش نظر تھا۔ اور ہو سکتا ہے کہ جنگِ آزادی کے دوران میں تہذیب و تمدن کا رشتہ

مذہب سے کاٹ کر وطن سے جوڑنے کی کوشش میں اس رجحان کا بھی ہاتھ ہو۔ تاکہ قدیم وطنی تہذیب و تمدن کے نام پر اپنی اس مخصوص تہذیب و معاشرت کا احیاء سیکولرزم کے نعرہ کے ساتھ ساتھ سرکاری وسائل سے کیا جاسکے۔ بہرحال وجہ جو کچھ بھی ہو اور اس احیائی ذہنیت کے وجود کا سلسلہ ماقبل آزادی تک دراز ہو یا نہ ہو، واقعہ جس کے نتائج سے بحث ہے وہ یہی ہے کہ ہندو تہذیب، ہندوستانی تہذیب کے نام پر سرکاری تہذیب بنتی جارہی ہے۔ اور سرکاری وسائل واثرات اس تہذیب کو فروغ دینے کے لئے پوری آزادی سے استعمال کئے جارہے ہیں۔ اسی گذشتہ جنوری کی بات ہے کہ ۲۶ جنوری کے جشن کے لئے یو۔ پی کے وزیر اعلیٰ نے ہدایت فرمائی تھی کہ اسے دسہرا اور دیوالی کی طرح منایا جائے۔ چنانچہ اس دن کا جشن ٹھیک اسی انداز پر منایا گیا۔ اس دن کے جلوس اور دسہرے کے جلوس میں بس اتنا ہی فرق تھا کہ اس میں کچھ چیزیں زیادہ تھیں، ورنہ دسہرے کے قریب قریب تمام ہی اجزاء اس میں شامل تھے! اور یہ کوئی ایک ہی سال کی بات نہیں۔ ہر سال یہی ہوتا ہے۔ پھر یہ بات صوبائی حدود تک بھی محدود نہیں ہے بلکہ عین ملک کی راجدھانی میں خود صدر جمہوریہ کے زیر سایہ بھی یہی سب ہوتا ہے۔ اسی ۲۶ جنوری کی رپورٹ ہے جس کا ایک ٹکڑا معاصر "صدق جدید" لکھنؤ نے دہلی کے ایک روزنامہ کے حوالے سے اپنی یکم مارچ ۵۷ء کی اشاعت میں نقل کیا ہے، لکھا ہے کہ:

"یوم جمہوریہ کی پُرمسرت تقریب پر..... راشٹرپتی بھون کا ہر گوشہ اپنے اندر کشش کا سامان رکھتا تھا۔ مگر خصوصیت کے ساتھ بڑے بڑے تیرتے ہوئے مصنوعی کنول کے پھول اور اس کے اندر سے برقی قمقمہ کی پھوٹتی ہوئی کرن اور خود بخود ان پھولوں کا کھلنا اور سمٹنا سب سے زیادہ جاذب نظر تھا۔ مگر..... ایک بات بُری طرح محسوس ہوئی وہ یہ کہ جب یہ کنول کے مصنوعی پھول کھلتے تھے تو اس میں لکشمی دیوی کی مورتی نمودار ہوتی تھی۔ حالانکہ اسی پھول سے آزاد ہندوستان کا نقشہ، تاج محل کا نقشہ یا مہاتما گاندھی کی مورتی بھی آسانی سے نمودار ہوسکتی تھی۔"

یہ دو مثالیں تو قومی تقریبات کے مواقع پر خالص سرکاری طرز عمل کی تھیں۔ سرکاری دائرہ سے باہر پبلک کاموں میں بھی آئے دن بڑی بڑی ذمہ دار شخصیتیں خالص ہندوانہ رسوم و رواج کا مظاہرہ کرتی اور اس طریقہ سے ہندو تہذیب و تمدن کی احیائی کوششوں کو سرکاری اثرات سے مدد پہنچاتی رہتی ہیں۔ معاصر "صدق جدید" ہی نے اپنی ۱۱ مئی ۵۶ء کی اشاعت میں یکم مئی کے اسٹیٹسمین (دہلی) کی ایک تصویر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وسط صفحہ کی ایک نمایاں تصویر میں نائب صدر جمہوریہ ایک بڑے جٹا دھاری کے ساتھ کھڑے ہوئے پوجا کر رہے ہیں اور غالباً منتر پڑھتے ہوئے آگ میں کچھ ڈال رہے ہیں۔ فوٹو کے نیچے یہ درج ہے کہ یہ پوجا ۲۹ اپریل کو نئی دہلی میں نئے پبلک اسکول کے افتتاح کے موقع پر ہو رہی ہے۔"

یہ تو تھے نائب صدر جمہوریہ، اور بالکل اسی قسم کا واقعہ ایک صوبائی چیف منسٹر سے متعلق ملاحظہ ہو:

"بمبئی کے ایک انگریزی معاصر "جام جمشید" مؤرخہ ۲۱ رجون کے صفحہ ۸ پر ایک تصویر ہے جس میں صوبہ کے وزیر اعلیٰ شری ڈیسائی اپنے ہاتھ سے ایک دیا (چراغ) جلاتے ہوئے دکھائے گئے ہیں اور سامنے یہ عبارت درج ہے: "احمد آباد کے بی۔ آئی زنانہ کالج کا افتتاح چیف منسٹر صاحب علم کی دیوی "سرسوتی جی" کے آگے دیا جلا کر کر رہے ہیں" (صدق ۶ رجولائی ۵۶ء)

قومی تقریبات کے مواقع پر سرکاری دائرہ میں "ہندو تہذیب" نوازی کا ذکر تو اوپر آچکا، ایک مثال سرکاری کاروبار میں بھی اس تہذیب کے عمل دخل کی سن لیجئے۔ ۲۵ ستمبر ۵۶ء کی خبر ہے کہ:

"بمبئی کی دولسانی ریاست کی وزارت جو یکم نومبر سے قائم ہونے والی تھی اب اس کی تاریخ ایک دن پہلے ہی مقرر کر دی گئی ہے یعنی ۳۱ راکتوبر کی رات۔ اس لئے کہ کالی چودس یکم نومبر کو پڑتی ہے اور نجومیوں کے نزدیک وہ ایک منحوس تاریخ ہے" (صدق ۱۲ راکتوبر ۵۶ء)

جوتشیوں یا نجومیوں کے کہنے پر اعتماد اور تاریخوں میں نحوست و سعادت کا اعتقاد اور اس کی بنیاد پر کسی کام کیلئے کسی تاریخ کا ترک اور کسی کا اختیار و انتخاب یہ خاص ہندو تہذیب کا امتیاز اور اس کی قدیم روایت ہے۔ مگر سیکولرزم کی قرارداد کے باوجود وزارت کی تشکیل جیسے خالص ریاستی مسئلہ میں اس روایت کا بالکل اسی طرح پاس کیا گیا جس طرح ہندوؤں میں شادی بیاہ کی تاریخ رکھنے میں اس کا لحاظ کیا جاتا ہے۔

اوپر برسر اقتدار طبقہ کے بعض خاص نظریات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، اس سے مراد مذہب کے بارے میں ان کا محدود تصور ہے۔ یعنی یوں تو دستور میں مذاہب کی آزادی اور اُن میں حکومت کی عدم مداخلت کا اصول تسلیم کیا گیا ہے اور ارباب حکومت ان دستوری تحفظات کے احترام کا یقین دلاتے رہتے ہیں مگر مذہب کا لفظ وہ اپنی ایک خاص اصطلاح کے طور پر بولتے ہیں جس کے مفہوم میں کم از کم اسلام کا تو ایک چوتھائی حصہ بھی نہیں آتا۔ چنانچہ وہ "سماجی اصلاح" کے نام سے سرکاری اور غیر سرکاری طور پر مسلسل ایسے اقدامات کر رہے ہیں جن سے اسلامی زندگی کے حصار میں شگاف پڑتے جا رہے ہیں۔ سرکاری اقدامات کی مثال معاشرتی زندگی سے تعلق رکھنے والے وہ قوانین ہیں جو گزشتہ چند برسوں میں پاس کئے گئے ہیں، جن کی زد میں مسلم پرسنل لاء کی متعدد دفعات آچکی ہیں۔ اس رُخ پر اقدامات کی یہ ابھی ابتدا ہے۔ لیکن قانون سازی کے جس جدید اصولی رجحان کے ماتحت یہ ابتدا ہوئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس میں ذرا شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ چھ عرصہ بعد پرسنل لا نام کی کوئی چیز اس ملک میں باقی نہیں رہ جائے گی۔

غیر سرکاری اقدامات کی سب سے بڑی مثال وزیر اعظم پنڈت نہرو کی وہ متعدد پبلک تقریریں ہیں جن میں اُنھوں نے برقع پوش مسلم خواتین کو دیکھ کر پردہ کے خلاف سخت لیکچر دئے ہیں اور پوری قوت سے مسلم خواتین کو بے پردگی پر آمادہ کرنے کی

کوشش فرمائی ہے۔

پردہ اسلامی معاشرت میں کیا اہمیت رکھتا ہے، وہ مسلم سوسائٹی کے کن مصالح کا ضامن ہے اور اُس کا خاتمہ اسلامی نقطۂ نظر سے کن مفاسد اور معائب کا پیش خیمہ بنے گا اور پھر اس کے نتیجہ میں عملی طور پر مجموعی اسلامی زندگی (جو خود ہی کافی ضعیف ہے) کن کن پہلوؤں سے مجروح ہوگی، ان سب باتوں کا جو لوگ کچھ اندازہ رکھتے ہیں وہی محسوس کر سکتے ہیں کہ یہ بات کتنی دور رس ہے۔

بہرحال یہ واقعہ ہے کہ ہندوستانی تہذیب کے نام پر ہندو تہذیب کے احیاء کے لئے سرکاری وسائل و اثرات بے دریغ استعمال ہو رہے ہیں اور ایوانِ حکومت تک میں اس کو نہایت آزادی کے ساتھ عمل دخل کا موقع مل رہا ہے۔

اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ کسی قوم (خصوصاً ایک مذہبی قوم) کی تہذیب اس کے مذہبی عقائد و خیالات کے اثرات سے نہ صرف آزاد نہیں ہوتی بلکہ اس کی تشکیل میں مذہب کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ تہذیبی اطوار و روایات کے سلسلہ میں ایک خیال، جس کا متحدہ قومیت کے سلسلہ میں بڑا پروپگنڈا کیا جاتا رہا ہے، یہ ہے کہ یہ چیزیں کسی سرزمین کے خاص جغرافیائی اور فطری ماحول کی بالواسطہ پیداوار ہوتی ہیں، مذہبی اصول و عقائد سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مگر اس پراپیگنڈے میں صداقت صرف اتنی ہے کہ جب تک کوئی قوم مذہب سے آشنا نہ ہوئی ہو اُس وقت تک وہ تمدنی تقاضوں کے ماتحت جو رنگ ڈھنگ اور زندگی کے طور طریق اختیار کرتی ہے وہ بے شک اس کے خاص جغرافیائی اور فطری ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں اور اُن کی تشکیل میں اس ماحول کے خاص اقتضاآت اور اس کے پیدا کردہ احساسات و رجحانات اور اندرونی کیفیات و جذبات ہی کا اصل ہاتھ ہوتا ہے۔ مگر کسی مذہب سے وابستگی کے بعد انسانی افکار، اس کے خوب و ناخوب کے معیارات اور زندگی کے بارے میں اس کے نقطۂ نظر میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اُن کے اثر سے اس کے تہذیبی نقشے میں قطع و برید اور تغیر و ترمیم نہ صرف ایک لازمی منطقی تقاضہ بلکہ ایک ناقابلِ انکار واقعہ ہے۔ کسی قوم کے بارے میں بھی آپ جستجو کیجئے اس کی تاریخ اگر ابتداء سے محفوظ ہے تو لازمی طور پر اس کی تہذیب کے دو دور آپ کے سامنے آئیں گے۔ ایک مذہب سے بیگانگی کے دور کی تہذیب اور دوسری کسی مذہب سے وابستگی کے بعد کی تہذیب۔ اور دونوں حالتوں کے تہذیبی نقشوں میں خواہ کوئی بنیادی فرق نہ ہو مگر دونوں کے رنگ یقیناً جابجا ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ تہذیب کا بنیادی خاکہ بے شک وہی رہتا ہے جس کے خطوط کسی انسانی گروہ کی تمدنی زندگی کی ابتدا ہی میں اس کے ماحول کے فطری تقاضوں اور اس سے پیدا ہونے والے احساسات و رجحانات وغیرہ اُبھار دیتے ہیں، مگر مذہب آکر اس خاکے میں نئے رنگ بھرتا ہے۔ اور انسان اس خاکے پر جو تہذیبی عمارت پہلے از خود (اپنی محدود نظر اور اپنی خواہشات کے مطابق) قائم کر چکا ہوتا ہے، مذہب سے آشنائی کے بعد جب اس کے افکار و تصورات کی دنیا بدلتی ہے اور وہ ایک نیا نقطۂ نظر اپنا لیتا ہے تو وہ اس عمارت کے صرف اُن اجزاء کو تو علیٰ حالہا باقی رکھتا ہے جو ان جدید تصورات و نظریات سے میل کھاتے ہیں۔ باقی جن کا

کوئی جوڑ ان تصورات کے ساتھ نہیں بیٹھتا انھیں یا تو منہدم کر دیا جاتا ہے یا تھوڑی بہت ترمیم کے بعد انھیں باقی رکھنے کے لائق بنا لیا جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی قوم اپنے مذہب کی اصلیت کو بھول کر اپنے مذہبی عقائد و تصورات کا سانچہ بدل ڈالتی ہے تو اس تغیر کا اثر بھی اس کے تہذیبی ڈھانچہ میں رونما ہوئے بغیر نہیں رہتا اور تہذیب کا نقشہ ایکبار پھر تغیر پذیر ہو کر اپنے آپ کو قوم کے مسخ شدہ عقائد و تصورات سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ اس کے لئے ہمیں تاریخ کے مطالعہ کی بھی ضرورت نہیں، ہم آج بھی دنیا کی مختلف قوموں کے احوال میں اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

الغرض کہنا صرف یہ ہے کہ کسی بھی مذہبی قوم کی تہذیب اس کے مذہب کی چھاپ سے خالی نہیں ہوتی اور وہ قوم جس طرح کے بھی مذہبی افکار و تصورات رکھتی ہے وہ اس کی تہذیب میں رچے بسے رہتے ہیں۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے ہندوستانی تہذیب کے نام پر ہندو تہذیب کو نوازنے کی جو پالیسی سامنے آ رہی ہے اُس نے جہاں مسلمانوں کے ایک طبقہ پر یہ اثر ڈالا ہے کہ وہ اس پالیسی کے قدرتی اثرات سے اپنے گھروں اور اپنی نوخیز نسل کی حفاظت کے لئے اپنے مذہبی حدود کی حفاظت میں سخت ہو گیا ہے، وہیں ایک طبقہ پر یہ اثر پڑ رہا ہے کہ ہندو دھرم کے عقائد و تصورات سے اس کا وہ بُعد ختم ہوتا جا رہا ہے جو آزادی سے پہلے باوجود ساری آزاد خیالیوں کے پایا جاتا تھا۔ کسی ملک کا حکمران طبقہ اگر کسی تہذیب کے ساتھ سرکاری یا غیر سرکاری طور پر نوازنے اور اپنانے کا معاملہ کرنے لگے تو "الناس علیٰ دین ملوکھم" کے اُصول پر یہ قدرتی بات ہے کہ جو لوگ پہلے اس تہذیب سے مانوس نہیں تھے انکی نامانوسیت رفتہ رفتہ ختم یا کم ہو جائے اور جن باتوں سے قریب ہونے میں انھیں طبعی رکاوٹ پیش آتی تھی ملک کا عام سرکاری اور غیر سرکاری فیشن بنتا ہوا دیکھ کر وہ ان سے مانوس ہونے لگیں چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کا وہ طبقہ جو غیر شعوری طور پر فیشن اور عام رواج کے رُخ پر چلنے کا مزاج رکھتا ہے اس کو اس وقت یہی صورت حال درپیش ہے۔ پہلے وہ دسہرے کے جلوس کے جن مشتملات کو ہندو مذہب کے تہذیبی مظاہر سمجھ کر صرف ایک اجنبی تماشائی کی طرح دور سے دیکھتا تھا، اب انھیں اجزا کو جب وہ عام ملکی تقریبات میں سرکاری اور غیر سرکاری دائروں میں اس پروپگنڈے کے ساتھ شامل دیکھتا ہے کہ یہ کسی خاص مذہبی تہذیب کے شعائر نہیں بلکہ مشترک وطنی تہذیب کے رسوم ہیں تو پھر ان چیزوں سے مانوسیت غیر شعوری طور پر اس کے ذہن میں راہ پانے لگتی ہے اور اس طرح تہذیبی حدود و فاصل کو پھلانگنا شروع کر دینے کی بنا پر ہندو مذہب کی رُوح سے اس طبقہ کا وہ ذہنی بُعد کم ہونے لگتا ہے جو پہلے تھا۔

ایک طبقہ اور ہے جس کا حال بھی کم و بیش کے فرق کے ساتھ یہی ہے مگر وہ عام رواج اور فیشن کے رُخ پر چل کھڑے ہونے کی نفسیاتی کمزوری کی بنا پر اس حال میں مبتلا نہیں ہو رہا ہے بلکہ اس کے حق میں ایک دوسری چیز مہیب بن رہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ عام ملکی زندگی سے انقطاع کو خلافِ مصلحت سمجھتا ہے، نیز ہندو مسلمانوں کے اتحاد اور اُن کے بہتر باہمی تعلقات کو مسلمانوں کے بہتر مستقبل کے لئے ضروری خیال کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اس قسم کی تقریبات میں شریک ہونے

اور اُن کے مذکورۂ بالا قسم کے اجزاء کو ہندو تہذیب کے رسوم و رواج کہہ کر اُن سے بیزاری ظاہر نہ کرنے کے لئے تاویلات کرتا ہے کہ یہ وقتی جنون ہے۔ رفتہ رفتہ سیکولرزم کا صحیح ماحول پیدا ہو کر یہ باتیں خود ختم ہو جائیں گی۔ مگر اس قرب اور مسلسل ان چیزوں کو انگیز کرنے کی کوشش نے اُس کے ذہن پر بھی یہ غیر شعوری اثر ڈال دیا ہے کہ اب ان چیزوں سے وہ وحشت باقی نہیں رہی جو اسلامی اُصول و عقائد کا تقاضا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ ایسے لوگ جس قسم کے سیکولر ماحول کی توقع میں ان چیزوں کو انگیز کر رہے ہیں کچھ دن اور گزرنے پر شائد خود ان میں بھی اس کا تقاضا باقی نہ رہے گا۔

یہ ہے وہ سب سے بڑا تغیر جو اس دس سال کے عرصہ میں مسلمانوں میں بتدریج رونما ہو رہا ہے اور جس سے کم از کم مسلمانوں کی نوخیز نسل کے حق میں بڑے سنگین نتائج کا خطرہ ہے۔

حکومت کی جس تہذیبی پالیسی کا ذکر اوپر ہوا اسی کا ایک جزو اس کی بیسک تعلیمی پالیسی ہے۔ بیسک تعلیم کی نصابی کتابیں ہندو دیو مالا، ہندو سماج کے رسوم و رواج، ہندوؤں کی مذہبی و تہذیبی اصطلاحات اور ہندوؤں کے مذہبی و سماجی بزرگوں کے تذکرہ سے اس طرح بھری ہوئی ہیں کہ نوعمر سادہ ذہن بچوں کے دل و دماغ کا ان سے متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ انھیں میں مسلمان بچے بھی ہوتے ہیں اور وہ بھی ان ابتدائی اسباق کا اثر تیزی سے قبول کر رہے ہیں۔

انھیں کتابوں کا اثر ہے کہ دس گیارہ برس کے مسلمان بچوں کا بکثرت یہ ذہن بن چکا ہے کہ ہولی دیوالی وغیرہ ہندو سماج کے تہوار گویا سب ہی ہندوستانیوں کی تفریحی تقریبات ہیں، چنانچہ کئی سال سے ان بچوں میں ان تقریبات کو تفریحی طور پر اپنانے کی وبا پھیل گئی ہے۔

انھیں کتابوں کا اثر ہے کہ ہندو دیو مالا کے قصص و حکایات اور اپنے بزرگوں کے بارے میں ہندوؤں کے مزعومات سے یہ بچے مانوس ہو رہے ہیں اور اسلامی توحید کی امانت اس نئی نسل کے سینوں سے نکلتی جا رہی ہے۔

انھیں کتابوں کا اثر ہے کہ آج بہت سے مسلمان بچے مسجد کو مندر پر قیاس کرتے ہیں، نماز کا مطلب پوجا پاٹ سمجھتے ہیں۔

اس ذیل کا کبھی کبھی کوئی عبرت انگیز واقعہ اخبارات میں بھی آجاتا ہے جس سے ان لوگوں کو بھی ہوا کا رُخ اور تغیر کی رفتار معلوم ہوتی رہتی ہے جن کے سامنے خود ایسے واقعات نہیں گزرتے۔ ۲۶ اکتوبر ۵۶ء کا صدق (لکھنو) راقم کے پیش نظر ہے جس میں لکھنؤ کے ایک شیعہ ہفتہ وار کے کالموں سے ذیل کا اقتباس درج کیا گیا ہے:

"شاید آپ حیرت سے انگشت بدنداں ہو جائیں جس وقت یہ سنیں کہ ایک شیعہ خاندان کا لڑکا جس نے صوبۂ متوسط کے کسی قصبہ یا دیہات میں پرورش پائی اور وہ آج نویں درجہ میں ہے، اُس کا الہ آباد آنے کا اتفاق ہوا، اس سے پوچھا گیا کہ مسجد چلوگے تو اس نے جواب دیا ہاں، جہاں پوجا ہوتی ہے۔ اُس کے عزیز ماسٹر صاحب نے کہا، اچھا بتاؤ مسجد میں کس کی مورتی ہوتی ہے۔ شیوجی کی یا وشنوجی کی؟ اُس نے جواب دیا کہ میں نے مسجد دیکھی نہیں ہے ابھی، اس لئے

کیا بتاؤں۔ دیکھ کر بتا سکتا ہوں۔ بس کتاب میں پڑھا ہے کہ مسلمان لوگ اس میں بھگوان کی پوجا کرتے ہیں۔"

اور بات صرف سمجھنے سمجھانے پر ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ ہندو عقائد و اوہام کے مطابق عمل تک ان مسلمان بچوں میں سرایت کر چکا ہے۔ آج کی نہیں کئی برس کی بات ہے ایک صاحب جو دفتر الفرقان میں محرر کی حیثیت سے کام کرتے تھے انہوں نے ایک اور اپنے ایک عزیز کے بچے کا یہ واقعہ مجھے خود سنایا کہ ایک دن گھر میں دیکھا گیا کہ بچہ ایک گوشہ میں ہندوانہ طرز پر ہاتھ جوڑ کر پیشانی کے سامنے کئے ہوئے کہہ رہا ہے کہ "کرشن جی مہاراج ہماری پنسل دلوا دیجئے" گھر والوں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس کی پنسل گھر کے کسی بچے نے چرالی تھی یا گم ہو گئی تھی، اور ایک دن اسکول میں ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا تو اس کے ماسٹر صاحب (گورو جی)، نے بازیابی کی یہی تدبیر بتا کر اور عمل کرا کر گم شدہ پنسل یا قلم واپس دلا دیا تھا اس سے ماسٹر تارا سنگھ کے اس انکشاف کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہندوؤں نے درپردہ یہ منصوبہ بنایا ہے کہ وہ تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں کے دل سے اسلام کو نکال دیں۔

بہرحال دس سال پہلے جو باتیں مسلمان بچوں کے متعلق سوچی نہیں جا سکتی تھیں وہ آج اس حد تک سامنے آچکی ہیں اور حاصل ان سب کا بھی وہی ہے کہ توحید اور شرک کا امتیاز مٹ رہا ہے اور شرک سے نہ صرف بُعد گھٹ رہا ہے بلکہ اس کے حدود میں داخلہ تک کی نوبت پہنچ گئی ہے۔ تغیرات اور بھی بہت سے ہو چکے ہیں، مگر یہ سب سے زیادہ سنگین تغیر ہے جو رونما ہو رہا ہے اور آزادی کے دس سال کا سب سے بُرا اثر ہے جو مسلمانوں پر پڑا ہے۔

اس عرصہ کے حالات کا ایک اور قابلِ ذکر اثر احساسِ کمتری اور مستقبل سے ناامیدی ہے ۱۹۴۷ء کے بعد سے کچھ ایسا ہو گیا جیسے مسلمانوں کے قوائے عمل شل ہو گئے ہوں اور رشتۂ امید ان کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا ہو۔ حالات کی ناسازگاری سے گھبرا کر انہوں نے اپنے آپ کو ایک کمزور اور تیرہ بخت گروہ تصور کر لیا ہے۔ اب عموماً وہ یا تو شکوہ و شکایت میں زندگی بسر کرتے ہیں یا مخالف ماحول سے نہایت نامناسب اور معیوب انداز میں صلح کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن شکوہ و شکایت یا "زمانہ سے ساز کرنے" کے بجائے ہمت و حکمت کے ساتھ خود زمانہ کو سازگار بنانے اور حالات کی ناموافقت کے علی الرغم مستقبل کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کی لگن اور کوشش ان میں اس طرح مفقود ہے جیسے اُن کی تاریخ میں اس کی نظیر ہی نہ ملتی ہو، یا وہ ایک مرتبہ زوال کے بعد عروج کا امکان ہی نہ تسلیم کرتے ہوں۔ ایک دو نہیں پورے دس سال اس حالت کو ہو چکے ہیں، افسردگی اور سرد مہری کا اتنا طویل عرصہ ان کی تاریخ میں شاید ہی کبھی گزرا ہو۔ بہرحال یہ تغیرات بھی ہیں اور اس لحاظ سے مسائل بھی کہ ان کو کیسے روکا جائے؟ مسلمانوں کو یہ سوچنا ہے کہ وہ کس طرح ان مسائل سے عہدہ برآ ہوں —— اور سوچنے کا وقت اگر نکل نہیں گیا ہے تو یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس کی آخری گھڑیاں ہیں۔ سوچا تو بعد میں بھی جا سکتا ہے مگر اس سے فائدہ اٹھانا کسی کے بس کی بات نہ ہوگی۔ بعد از وقت سوچنے کا مآل بجز حسرت کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

(الفرقان لکھنؤ)